باب۔۳

ترجمہ

فص نوحیہ

حکمت سبّوحیہ

واضح ہو کہ تنزیہ محض، اہل حقائق یعنی صوفیہ صافیہ کے پاس عین تحدید اور تقئید (یعنی محدود اور مقید کر دینا) ہے۔ (اس لیے کہ ایسا کرنا) وجودِ حقیقی کو تنزیہ سے مقید کرنا ہے کہ وہ تشبیہ میں نمایاں نہیں ہو سکتا۔ تنزیہ محض کرنے والا یا تو جاہل ہے یا بے ادب۔ شریعت و قرآن و کتاب اللہ کا معتقد اور ان پر ایمان رکھنے والا اگر تنزیہ محض کرے اور تنزیہ کے پاس ٹھیر جائے اور اس کی رائے، اس کے یعنی تنزیہ کے سوائے نہ ہو اور وہ تشبیہ کا قائل نہ ہو تو وہ سوئے ادب کا مرتکب اور حق تعالیٰ اور رُسل صلوات اللہ علیہم کی، (خود) اپنی بے شعوری کی وجہ سے تکذیب اور مخالفت کرتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کو تحقیقات سے کچھ حصہ ملا ہے۔ حالاں کہ اس سے بہت کچھ فوت ہو گیا ہے۔ وہ تو ایسا ہو گیا ہے جیسے آمن ببعض و کفر ببعض، (یعنی کہ) بعض آیات پر ایمان لاتا ہے اور بعض سے کفر کرتا ہے۔ قرآن شریف میں تنزیہ کے لیے (آتا ہے) لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ، (یعنی) اس کے جیسی کوئی شئے نہیں [(الشوریٰ:۱۱)]۔ (اس کے علاوہ ہے)] اللَّـهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ، (یعنی) اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی اولاد ہے، نہ ماں باپ [(الاخلاص:۲، ۳)]۔ (اور فرمایا)] رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ (یعنی) رب العزت اس سے بلند ہے، جن صفات سے کہ یہ بیان کرتے ہیں، (الصافات:۱۸۰)۔۔۔ تو تشبیہ کے لیے آیاتِ ذیل بھی ہیں۔ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ، (یعنی) اور وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں رہو، (الحدید:۴)۔ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ یعنی) وہی سنتا ہے وہی دیکھتا ہے، (الشوریٰ:۱۱)۔ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (یعنی) وہ تمھارے نفوس میں ہے، کیا تم نہیں دیکھتے، (الذاریات:۲۱)۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ۔ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (یعنی) چند لوگوں کے چہرے تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے، (القیٰمۃ:۲۲، ۲۳)۔ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَـٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ (یعنی) ہم اس سے بہ نسبت تمھارے زیادہ قریب ہیں مگر تم نہیں دیکھتے، (الواقعہ:۸۵)۔

یہ معلوم ہے کہ شرائع الٰہیہ (یا اللہ کے قوانین) حق تعالیٰ کے حق میں جو کچھ کہتے ہیں حق ہی کہتے ہیں۔ اب اس سے عامۃ الناس (یعنی عام لوگ) تو وہی معنی و مراد سمجھتے ہیں جو ظاہری الفاظ سے نکلتے ہیں۔ اور خاص خاص لوگ اس زبان کی وضع سے جو جو احتمالات (اور ممکنات) نکل سکتے ہیں مراد لیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر مخلوق میں ظہورِ خاص ہے۔ وہ ظاہر ہے ہر مفہوم کلی و جزئی میں، (اور) وہ باطن ہے ہر فہم و عقل سے۔ البتہ وہ شخص کچھ سمجھتا ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ عالم، حق تعالیٰ کی صورت بھی ہے اور اس کی ذات و ہویتِ مقدسہ سے جدا بھی نہیں ہے۔ عالم میں ھو الظاہر کا ظہور ہے۔ حق تعالیٰ ممکنات و مخلوقات میں {جو حق تعالیٰ کے اسما و صفات کے مظاہر ہیں} بمنزلۂ روح کے ہے۔ حق تعالیٰ کو اپنے مظاہر اور صورِ عالم سے وہی نسبت ہے جو روحِ انسانی کو اس کی صورت اور جسم سے ہے۔ دیکھو انسان کی حد اور تعریف میں روح و تن اور باطن و ظاہر دونوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ انسان صرف تن نہیں ہے بلکہ روح و تن دونوں کا مجموعہ ہے۔ یہی حال ہر محدود و معرّف (یعنی ہر خاص و معروف یا اسپیشل) کا ہے کہ اس کے ظاہر و باطن دونوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

پس حق تعالیٰ اپنی ذاتِ مقدسہ اور شان تنزیہ کہ وجہ سے غیر محدود ہونے کے باوجود اپنے اسما اور ان کے ظہور کے لحاظ سے ہر حد اور تعین سے محدود و متعین ہے۔ عالم کی صورتیں بے انتہا اور خارج از ضبط و احاطہ ہیں۔ کسی صورت کسی شئے کو آدمی جانتا بھی ہے تو صرف اس قدر جس قدر کہ اس شئے کی صور و حالات معلوم ہوں۔ اس لیے حق تعالیٰ کی تعریف نامعلوم ہے، کیوں کہ حق تعالیٰ کو اتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا صور عالم کے حالات کا علم ہو۔ تمام صورتوں اور اشیا کا علم حاصل ہونا محال ہے۔ تو خدائے تعالیٰ کی حد اور تعریف کرنا بھی محال اور ناممکن ہے۔

جو تشبیہ محض کا قائل ہے اور تنزیہ نہیں کرتا ہو، وہ صاحبِ تجسیم ہے یعنی خدائے تعالیٰ کو صاحبِ جسم سمجھتا ہے اور وہ "فرقۂ مجسمہ" (میں) سے ہے۔ وہ (بھی) حق تعالیٰ کو، مقید اور محدود سمجھتا ہے۔ (دراصل) اس کو حق تعالیٰ کی معرفت ہے ہی نہیں۔ جو عرفانِ حق میں تنزیہ و تشبیہ دونوں کا قائل ہے اس کو اجمالاً ہی جانتا ہے۔ تفصیلاً کب جانتا ہے؟۔۔۔ یہی تو وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے معرفتِ حق کو معرفتِ نفس سے مرتبط کیا ہے، اور من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ فرمایا۔ [(یعنی) جس نے خود کو جانا تو خدا کو جانا (حدیث۔ کتب الصوفیہ)]۔

خود فہمی ہے خدا فہمی خود میں سرّ حقیقت ہے

[سورۃ فصلت کی آیت ۵۳ میں حق تعالیٰ فرماتا ہے، سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ،(یعنی)] ہم تم کو اپنی نشانیاں آفاق میں دکھائیں گے۔ یہاں آفاق سے مراد وہ شئے ہے جو تم سے باہر ہو۔(اسی آیت میں آگے ہے) وَفِي أَنفُسِهِمْ،(یعنی) اور ان کے انفس میں۔ انفس سے مراد تمھاری ذات، تمھارا عین ہے۔(وہ مزید فرماتا ہے) حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ،(یعنی) تاکہ ان کو{یعنی ناظرین کو} ظاہر ہو جائے کہ وہی موجودِ حقیقی ہے۔ اس لحاظ سے کہ تم اس کی صورت ہو اور وہ تمھاری روح ہے۔ روح الارواح ہے۔ سر الاسرار ہے۔ تم ذاتِ حق کے لیے ایسے ہو جیسے تمھاری جسمانی صورت تمھارے لیے۔ حق تعالیٰ تمھارے لیے اس طرح ہے جس طرح تمھاری روح، جوہر بدن ہے۔ تمھارے بدن اور جسد کی صورت کے لیے تمھارے جاننے میں، تمھارے ظاہر و باطن کا جاننا شامل ہے۔ جب روحِ مدبّر، تن سے نکل جائے اور خالی تن رہ جائے تو انسان کہاں رہا۔۔۔! اس تنِ بے جان کو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کی صورت انسان کی صورت سے مشابہ ہے۔ اس گوشت پوست کی صورت اور لکڑی یا پتھر کی صورت میں کیا فرق ہے؟۔۔۔ اس کو انسان نہیں کہہ سکتے مگر بطور مجاز کے، نہ کہ بطور حقیقت کے۔ جسم انسانی، روح انسانی سے جدا ہو جاتا ہے مگر صور عالم ممکن نہیں کہ ذاتِ حقہ سے جدا ہوں۔

الوہیتِ حق، عالم کے لیے بالحقیقت ہے، نہ کہ بمجاز۔ جیسے تعریفِ انسان، بحالتِ حیات تعریفِ حقیقی ہے، اس لیے کہ اس حال میں روح و جسم دونوں ملے ہوئے ہیں۔ جیسے انسان کی ظاہری صورت یعنی جسم اپنی زبانِ حال سے اپنی روحِ مدبر اور نفس کی ثناو تعریف کرتی ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے صور عالم کو ایسا پیدا کیا کہ اللہ کی تسبیح و حمد و تعریف کریں، مگر ہم اس کو نہیں سمجھتے۔(وہ یوں کہ) ہم عالم کے تمام صور کو احاطہ نہیں کر سکتے۔ سب حق کی زبانیں ہیں جو حق کی ثنا میں گویا ہیں(بولتی ہیں)۔ اسی لیے فرمایا الْحَمْدُ لِلَّـهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ[(یعنی) تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام عالموں کی پرورش کرنے والا ہے،(الفاتحہ:۱)] یعنی حامدیت یا حمد کرنا اور محمودیت یا حمد کیا جانا، دونوں کا مرجع اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

فان قلت بالتنزیہ کنت مقیداً۔ اگر تم تنزیہ محض کے قائل ہو گے تو
حق تعالیٰ کو مقید کر دو گے۔

وان قلت بالتشبیہ کنت محدِداً۔ اگر تم تشبیہ محض کے قائل ہو گے تو
حق تعالیٰ کو محدود کر دو گے۔

وان قلت بالامرین کنت مسدّداً۔ اگر تم دونوں کے قائل ہو گے تو
راست رَو(سیدھی راہ پر) رہو گے۔

وکنت اماماً فی المعارف سیداً۔ اور معارف میں امام اور سردار ہوگے۔

فمن قال بالاشفاع کان مشرّکاً۔ اگر تم دوئی کے قائل ہو اور حق و خلق کو بالکل جدا سمجھوگے تو تم شرک فی الوجود کروگے۔

ومن قال بالافراد کان موحداً۔ اگر عبد و رب کو وجود حقیقی اور منشا کے لحاظ سے عین یک دیگر سمجھوگے اور یکی و یکتائی کے قائل ہوگے تو تم موحد ہوگے۔

فایاک والتشبیہ ان کنت ثانیاً۔ تشبیہ محض سے بچو، اگر دوئی کے قائل ہو۔

وایاک والتنزیہ ان کنت مفرداً۔ تنزیہ سے بچو اگر یکی و یکتائی کے قائل ہو۔

فما انت ھو بل انت ھو و تراہ فی۔ تم اس کے عین نہیں ہو باعتبار آثار و احکام و حقائق کے بلکہ تم اس کے عین ہو بلحاظ وجود حقیقی کے۔

عین الامور مسرّحاً و مقیداً۔ اس کو اطلاق و تقئید دونوں میں تمام اشیا کا عین دیکھوگے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے، لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ، (الشوریٰ:۱۱)۔ (یہاں) کاف زائد بمعنیٰ لیس مثلہٖ شئی، اس کے جیسا کوئی نہیں۔ پس یہ تنزیہ ہے۔ وَھُوَ السَّمِیعُ الْبَصِیرُ، (الشوریٰ:۱۱)، وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ یہ تشبیہ ہے۔ کیوں کہ سننا اور دیکھنا بندوں کی صفت کے مشابہ ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ {کاف زائد نہیں} یعنی، اس کے خلیفہ، انسانِ کامل کے جیسا کوئی نہیں۔ اس میں تشبیہ بھی ہے اور دوئی بھی ہے۔

اس کی تصویر کے سوا حسرتؔ
کوئی ویسا نظر نہیں آتا

وَھُوَ السَّمِیعُ الْعَلِیمُ [(یعنی) وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، (البقرۃ:۱۳۷، اور کئی اور آیات میں بھی)]۔ خبر پر لام ہے جس سے حصر (یا محدود کرنا) کے معنیٰ پیدا ہوتے ہیں۔ وہی سنتا ہے اور وہی جانتا ہے۔ اس سے تنزیہ اور افراد و توحید اور یکی ثابت ہوتی ہے۔

اب میں تفسیر و اعتبار کا فرق بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ شیخ عربیؒ اور دیگر شیوخ اکثر آیاتِ قرآنی کو ایسے معانی پر ڈھالتے ہیں جو قرآن شریف کے سیاق و سباق کے موافق نہیں۔ اور علما اُن پر اعتراض کرتے ہیں۔۔۔ (مترجم)

اعتبار: گزر جانا، عبرت لینا۔۔۔ بزرگوں کی عادت ہوتی ہے، ہر شئے سے، ہر قول سے، ہر واقعے سے عبرت لینا۔ نصیحت پکڑنا۔ متاثر ہونا، اور اُس کو اپنے اوپر ڈھال لینا۔ وہ قرآن شریف پڑھتے ہیں اور ہر ایک آیت کو اپنے آپ پر منطبق کرتے جاتے ہیں۔

شیطان، کفار، اور دوسروں کے بُرے حالات کو اپنے نفس امارہ (یعنی وہ خواہش جو انسان کو برے کاموں پر آمادہ کرے) پر منطبق کرتے ہیں۔ پیغمبروں کا ذکر سنتے ہیں اور نفس لوامہ (یعنی وہ خواہش جو انسان کو اچھے کاموں پر آمادہ کرے) کو مراد لیتے ہیں۔ قلبِ سلیم کا ارادہ کرتے ہیں (تو) لیلیٰ مجنوں کا شعر سنتے ہیں۔ لیلیٰ سے محبوبِ حقیقی کی طرف لے جاتے ہیں اور مجنوں سے اپنے آپ کو مراد لیتے ہیں۔ جہاں شراب کا ذکر آیا انھوں نے محبت مراد لی۔ ملّا نور الدین عبد الرحمٰن جامیؔ نے شیخ عمر بن فارض بکری کے قصیدۂ تائیہ کی شرح کی ہے اور اس میں اعتبار ہی کو دکھلایا ہے۔ خواجہ شمس الدین حافظؔ کے دیوان کی شرح بعض حضرات نے کی ہے اور تمام اعتبارات سے بھر دیا ہے۔ بلکہ حافظؔ کے اشعار کے لفظی معنیٰ کوئی نہیں لیتا۔ لوگوں نے اعتبارات پر کتابیں لکھی ہیں۔ چند الفاظ کے اعتبار یہاں لکھتا ہوں جس سے اُن کا مقصد ظاہر ہو جائے۔

میکدہ، خانقاہ، شراب، محبت، پیر مغاں، شیخ کامل، گیسو، شان احدیت، اشارۂ ابرو، الہام، ہاتف غیبی، بت، محبوب حقیقی، خمخانہ، مقام عشق و محبت، صاحب عقل، مجوب، مست، عاشق، رنگ، ظہور ذات و صفات و افعال، قتل، فنائیت، صبح، بسط، شام، صبا، نفحات رحمانیہ، کیمیا، نظر و توجہ شیخ کامل، کافر، غیریت محض کا منکر، نفس امارہ۔ (وغیرہ)

غرض اس قسم کے ان کے محاورے ہیں۔ ان کے نہ سمجھنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ شیخ عربیؒ نے اسی لیے "فتوحات مکیہ" کے شروع میں اپنے عقائد بیان کر دیے ہیں تاکہ اسی قرینے سے ان کے کلام کی تاویل کی جائے۔ اور حقیقی و لفظی معنیٰ مراد نہ لیے جائیں۔ یہاں نوح سے مراد تنزیہ محض ہے، اور محمدی سے مراد جامع تنزیہ و تشبیہ ہے۔

یہ بات یاد رکھو کہ اعتبار میں ضروری نہیں کہ پورا قصہ منطبق (یا موافق) ہو جائے۔ بعض حصے سے بھی اعتبار لیا جاتا ہے۔۔۔ گو بعض دوسرا حصہ اعتبار کے ناموافق ہی ہو۔۔۔ یہ تفسیر تو ہے ہی نہیں کہ ماقبل و مابعد

(یعنی اگلا اور پچھلا متن) سب مرتبط ہوں۔ یہ بھی معلوم رہے کہ اعتبار، جس قدر آیاتِ قرآنی سے لیا جاسکتا ہے کسی اور کلام سے نہیں لیا جاسکتا۔

تفسیر: تفسیر تو وہ معنیٰ ہیں جو الفاظ سے نکل رہے ہیں۔ سیاق و سباق اور اگلی پچھلی عبارتیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ زبان کا محاورہ اس کی تائید کرتا ہے۔ شانِ نزول اور غرضِ متکلم اس کی مدد کرتی ہے۔ یہ بات اعتبار میں نہیں ہوتی۔

(نوٹ: اعتبار اور تفسیر سے متعلق مترجم کی خصوصی وضاحت کے بعد اب آگے ترجمہ و تشریح کا سلسلہ دوبارہ جاری ہے۔ مرتب)

اگر نوح یعنی عقل منزہ قائلِ تنزیہ، اپنی قوم {خطرات و خیالات} کو تنزیہ اور تشبیہ دونوں کی طرف دعوت دیتے تو ان کی قوم (خطرات و خیالات) کو ان کی ہدایت و دعوت قبول کر لینا دشوار نہ ہوتا۔

قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ۔ أَنِ اعْبُدُوا اللَّـهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ۔ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى۔ إِنَّ أَجَلَ اللَّـهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ۔ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا۔ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا، (یعنی) کہا اے میری قوم، میں تم کو صاف صاف ڈراتا ہوں کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ خدا تم کو تمھارے گناہ بخش دے گا اور تم کو مقررہ وعدے تک ڈھیل دے گا۔ خدا کا وعدہ جب آجاتا ہے تو پھر دیر نہیں کرتا۔ کاش تم سمجھتے۔ کہا، میرے پروردگار میں اپنی قوم کو بلاتا رہا رات اور دن، پھر وہ میرے بلانے سے اور بھاگنے لگے، (نوح:۲تا۶)۔

پھر نوح {عقلِ منزہ} نے قوم {خطرات} کو تنزیہ کی طرف بآواز بلند بلایا۔ پھر پوشیدہ طور پر بلایا۔ پھر قوم {خطرات} سے کہا۔ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا، (یعنی) تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بڑا غفار ہے، (نوح:۱۰)۔۔۔ نوح {عقل منزہ} نے کہا، میں نے اپنی قوم {خطرات} کو رات دن تنزیہ کی طرف بلایا مگر میرے بلانے نے ان کو اور بھگایا، اور اپنی قوم {خطرات و خیالات} کا حال بیان کیا کہ وہ ان کی دعوت کے سننے سے بہرے بن گئے ہیں حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ تنزیہ کو قبول کرنا ان پر واجب تھا۔ علمائے عارف باللہ نے اعتبار کے طور پر، نہ کہ تفسیر کے طریقے پر، نوح علیہ السلام سے جو اپنی قوم کے حق میں فرمایا ایک اشارہ پایا۔۔ یہ قول اعتبار میں بظاہر ذَم (یعنی برائی بیان کرنا) اور بباطن ثنا (یعنی تعریف کرنا) تھا۔ عرفا نے یہ سمجھا کہ قوم {خطرات و خیالات} نے دعوتِ نوح {عقل منزہ} کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ تنزیہ محض

فرقان، یعنی دوئی و غیریت پر مبنی ہے، اور حقیقت و نفس الامر قرآن پر مبنی ہے۔ یعنی تنزیہ و تشبیہ، عینیت و غیریت، یکی و دوئی کا جمع کرنا ضروری ہے۔ نفس الامر فرقان یعنی غیریتِ محض پر واقع نہیں۔ جو عینیت میں قائم ہو وہ غیریت کی کیا سنے گا۔ اگرچہ جمع عینیت و غیریت میں عینیت موجود ہے۔ صرف تشبیہ یا محض تنزیہ میں جامعیت کہاں۔ یہی وجہ تو ہے کہ خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت اس جامعیت سے خاص کیے گئے ہیں۔ یہ امت بھی کیسی ہے ؟۔۔۔ بہترین نبی کی بہترین امت جو لوگوں کی ہدایت کے لیے انتخاب کی گئی۔

آیت، لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ [(یعنی) کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، (الشوریٰ:۱۱)] کو دیکھو کہ تنزیہ و تشبیہ دونوں کو ایک ذاتِ حقہ میں جمع کر دیا، اور وہ بھی ایک آیت میں۔۔۔ ایک جملے میں۔ اگر نوح {عقل منزہ} کوئی ایسی بات کہتے تو قوم {خطرات} قبول بھی کر لیتی۔ کیوں کہ صاحبِ جمع یعنی خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشبیہ و تنزیہ دونوں کو جمع کرنے والے نے، تشبیہ و تنزیہ، وحدت و کثرت، اجمال و تفصیل، عینیت و غیریت، یکی و دوئی دونوں کو جمع کر دیا۔ ایک آیت، ایک بات میں۔۔۔ بلکہ نصف آیت میں۔

نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی۔ رات کو۔ یہ ان کے عقول و روحانیت کے لحاظ سے یعنی ان کے ظاہری صور کے لحاظ سے، اوروں کو بھی دعوت دی {اس لیے کہ وہ غیر مرئی غیب ہیں}۔ یہ سب اعتبار ہے نہ کہ تفسیر۔ مگر اپنی دعوت میں عینیت و غیریت، تنزیہ و تشبیہ کو جمع نہیں کیا، جیسے لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ میں جمع ہیں۔ اس دوئی کی وجہ سے ان کے باطن نفرت کرنے لگے، اور وہ لگے بھاگنے۔

پھر اپنے متعلق نوح علیہ السلام نے کہا کہ انھوں نے اپنی قوم کو بلایا، دعوت دی، تبلیغ کی تاکہ حق تعالیٰ اپنی تنزیہ میں چھپا لے اور وہ فنا ہو جائیں۔ اس لیے نہیں کہ ان پر حقیقتِ امر یعنی جمع تشبیہ و تنزیہ منکشف ہو جائے۔ تنزیہ میں فنا کی دعوت اس لیے دی کہ وہ تشبیہ پر اڑے ہوئے تھے۔ قوم نے اپنی فنائیت کو قولِ نوح علیہ السلام سے سمجھا۔۔۔ یہ سب اعتبار ہے، تفسیر نہیں ہے۔

فنائیت کے خوف ہی سے انھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں رکھ لیں اور اپنے اوپر چادریں اوڑھ لیں۔۔ یہ تمام کام جو وہ کر رہے تھے یہ بھی چھپنا اور ایک طرح کی فنائیت تھی کیوں کہ کانوں میں انگلیاں رکھنے

سے سماعت فنا ہو جاتی ہے اور چادر اوڑھنے سے ان کا جسم غائب و فنا ہو جاتا تھا۔ اس قوم نے دعوت و تبلیغ پر لبیک تو نہ کہا، مگر عمل وہی کیا جس کی دعوت دی جاتی تھی۔۔۔ یہ سب اعتبار ہے۔

پس لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ میں کاف زائد نہ ہو تو اثباتِ مثل یعنی خلیفۃ اللہ ہے۔ کاف زائد ہو تو نفیٔ مثل ہے یعنی کوئی خدائے تعالیٰ کے جیسا نہیں۔ اسی جامعیت کی وجہ سے کہ اپنی ذاتِ مقدسہ کے متعلق خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔۔(قرآن)"جوامع الکلم" کو دیا گیا ہے، یعنی (مجھے) کلام مبارک مختلف پہلوؤں پر پورا اترتا ہے۔۔ لہٰذا آپؐ نے اپنی قوم کو رات دن کی طرف دعوت کی یعنی تنزیہ و تشبیہ کی الگ الگ تبلیغ نہیں کی۔ بلکہ محمدیوں کو(بتلایا کہ)رات میں دن ،یعنی تنزیہ میں تشبیہ اور بطون (یعنی پوشیدگی) میں ظہور ہے۔ دن میں رات، یعنی تشبیہ میں تنزیہ اور ظہور میں بطون ہے۔

پس نوح علیہ السلام نے اپنی حکمت و معرفت میں اپنی قوم سے فرمایا۔ اگر تم تنزیہ ذاتِ حق کے قائل ہو گے تو تم پر حق تعالیٰ ایسے ابر باراں بھیجے گا جو لگاتار برسیں گے۔۔ اس سے مراد معارفِ عقلیہ اور نظر اعتباری معانی میں ہے، اور تم کو احوال سے امداد دے گا۔ یعنی ایسے معارف دے گا جو تم کو ذاتِ حق کی طرف مائل کر دیں گے۔ اگر وہ معارف تم کو اسی کی طرف مائل کر دیں گے تو تم اپنی صورت و حقیقت و عین کو ذاتِ حقہ میں دیکھو گے۔ جس طرح تم آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہو۔ جس نے خیال کیا کہ اس نے حق تعالیٰ کو دیکھا، اس کو کچھ معرفت نہ ملی۔ جس نے سمجھا کہ میں نے اپنی حقیقت کو ذاتِ حق میں دیکھا، وہ بے شک عارف ہے۔ اسی لیے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ۱) عارف۔ ۲) غیر عارف۔

پوری آیت یہ ہے۔قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا (یعنی)نوحؑ نے عرض کیا، میرے پروردگار! انھوں نے میری نافرمانی کی، اور اس کی پیروی کی جس کو مال اور اولاد نے نقصان ہی نقصان کیا،(نوح:۲۱)۔۔۔ یہاں' ولد' سے نتائج نظر فکری مراد اور اعتبار لیا جاتا ہے، یعنی ان کے غور و فکر نے ان کو کوئی فائدہ نہیں دیا۔ (دراصل) معرفتِ الٰہی مشاہدے پر موقوف ہے (اور یہ) نتائجِ فکر و نظر سے بالکل دور ہے۔

ان کی تجارت نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا۔ ان کے ہاتھ میں جو کچھ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ جن چیزوں کو وہ اپنی سمجھتے تھے، اپنی ملک خیال کرتے تھے، کچھ بھی نہ رہا۔ اِس وقت اُمتِ نوحؑ سے اہلِ فنا مراد لے رہے ہیں

اور اُمت محمدیؐ سے اہل بقا۔۔۔ محمدیوں کے لیے وارد ہو رہا ہے۔ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ،(یعنی) {اے محمدیو !۔۔۔ اے اہل بقا !} خرچ کرو اس چیز میں سے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان کے متعلق خلیفہ بنایا،(الحدید:۷)۔ اہلِ فنا جو کچھ اپنا اپنا جانتے تھے، کھو دیتے ہیں۔ اور اہلِ بقا ملک خدا کو بحیثیت خلافت دیتے ہیں (اور) دلاتے ہیں۔۔۔ (قرآن کہتا ہے) أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا،(یعنی) کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بناؤ،(الاسراء:۲)۔۔۔ ملک تو امت نوح کی رہی، اور اس میں وکالت اللہ کی۔

یہ حال اہلِ قرب نوافل کا ہے۔ قربِ نوافل کیا ہے؟۔۔ اپنی ملک سمجھنا۔ اپنی غرض پیش نظر رکھنا۔ ذاتی ارادہ رکھنا (اور) اس کے واسطے خدا کو وکیل بنانا۔ (جب کہ) محمدیوں یعنی اہلِ قرب فرائض کی کچھ بھی ملک نہیں۔ بلکہ ملک اللہ ہی کی رہتی ہے اور یہ اللہ کے خلیفہ رہتے ہیں۔ اس کی طرف سے کارگزار رہتے ہیں۔ یہ حال اہلِ قرب فرائض کا ہے۔ قربِ فرائض کیا ہے؟۔۔۔ حکم الٰہی پر چلنا۔ تحتِ امر رہنا۔ بے ارادہ جینا۔ مردہ بدستِ زندہ رہنا۔

ہاتھ میں ان کے ہوں میں کٹھ پتلی وہ جو چاہے وہی کرتا ہوں میں
آپ جو کہتے ہیں کہہ دیتا ہوں میں نہ زندہ ہوں نہ مردہ ہوں میں
مقصد مرا وہی ہے جو مطلب ہے یار کا
میں اپنے اختیار میں بے اختیار ہوں

گویا نوافلی، خدا پر حکومت کرتا ہے، اور قربِ فرائض والے پر خدا حکومت کرتا ہے۔ اس کو یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ نوافل میں خدا بندے کا ہاتھ پاؤں ہو جاتا ہے۔ اہل فرائض میں بندہ خدا کا ہاتھ پاؤں ہو جاتا ہے، یعنی اس کے امر کو اور غرض کو پورا کرتا ہے۔ بہر حال قوم نوحؑ کی ملک ثابت کی گئی اور خدا کی وکالت۔ اُمت محمدیؐ کی خلافت ثابت کی اور ملک خدا ہی کی رہی۔۔۔ دوم، نوحؑ کی ملک بھی کیسی تھی؟۔۔۔ حقیقت میں ملکِ خلافت ہی تھی، نہ کہ اصلی ملک۔ جب خدا وکیل ہوا اور بندہ مؤکل، اور مؤکل کی وکیل پر حکوت چلتی ہے تو بندے کی حکومت خدا پر چلی۔ تو خدا ملک ہوا۔۔۔ اسی لیے ترمذیؒ نے کہا۔ "یارب اگر میں تیری ملک ہوں تو، تُو بھی میری ملک ہے۔"

(وَمَكَرُوا)، اور انھوں نے بڑا مکر کیا،(اٰل عمران:۵۴)۔ اس میں اعتبار یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف بلانا اُس شخص کے ساتھ مکر ہے جس کو بلاتے ہیں۔ کیوں کہ حق تعالیٰ سے کب فصل تھا کہ اب وصل ہو گا۔

أَدْعُو إِلَى اللّٰـهِ، (یعنی) میں خدا کی طرف بلاتا ہوں، (یوسف:۱۰۸)۔ یہ سامعین کی بصیرت کے ساتھ مکر ہے۔ پس انھوں نے متنبہ کیا کہ تمھارا کچھ نہیں، سب خدا کا ہے۔ سامعین نے بھی عملی طور پر فنائیت پیدا کر کے یعنی کانوں میں انگلیاں دے کر انکار کی صورت پیدا کی۔ ان کے بعد محمدی آیا۔ سمجھ گیا کہ دعوت الی اللہ کے معنٰی ذاتِ حق کی طرف (ہی) بلانا مقصود نہیں بلکہ تجلیاتِ اسماے الٰہیہ کی طرف بھی بلانا مقصود ہے۔ پھر کہا، یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَـٰنِ وَفْدًا، (یعنی) جس دن کہ ہم متقیوں کو رحمان کی طرف جمع کریں گے (مریم:۸۵)۔ (یہاں) لفظ إِلَى کو الرَّحْمَـٰنِ سے ملایا۔ اس سے ہم نے سمجھ لیا کہ عالم زیرِ تجلی اسم الٰہی تھا جس کی وجہ سے ان کو متقی و پرہیز گار بننا پڑا۔

انھوں نے اپنے مکر میں کہا۔ لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (یعنی) تم اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو۔ اور نہ چھوڑو وَد بت، سواع بت، یغوث بت، یعوق بت اور نسر بت کو، (نوح: ۲۳)۔

اعتبار: اگر ان بتوں کو چھوڑ دیتے تو ان ظہورات سے جو ان بتوں میں تھے جدا ہو جاتے۔ کیوں کہ حق تعالیٰ کی ایک وجہ، ایک تجلی، ہر معبود بلکہ ہر مخلوق اور ہر شئے میں ہے۔ جو اس شئے کو جانے گا اس میں کی وجہِ حق کو جانے گا۔ جو کسی شئے کو نہ جانے گا تو اس میں کی وجہِ حق سے بھی جاہل رہے گا۔

مرآت حقائق ہے یہ دنیا میرے آگے ہر ایک میں ہے یار کا جلوہ مرے آگے
بے وجہ نہیں دل کشیٔ صورتِ باطل باطل میں بھی ہے حق کا تماشا مرے آگے

محمدیوں کے لیے نازل ہوا۔ وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (یعنی) تمھارے پروردگار نے حکم دیا کہ تم عبادت نہ کرو مگر اس کی، اور صرف اس کی، (الاسراء:۲۳)۔۔۔ اس لیے کہ وہ واجب الوجود ہے، منبع الجود ہے عالی جناب ہے، رب الارباب ہے۔

اعتبار: عارفِ محمدی جانتا ہے کہ در اصل کس کی پوجا کی گئی، اور حق تعالیٰ کس صورت میں، کس مظہر میں جلوہ گر ہوا کہ لوگ لگے اس مظہر کو پوجنے۔ گو خود پوجنے والا جاہل پوجے اور حق کی جلوہ گری نہ دیکھے۔

مسجد میں رہو تو تم کو میں مانتا ہوں مندر میں چھپو تو تم کو میں جانتا ہوں
جس رنگ میں آؤ کچھ نہیں ہے پروا اس ناز و ادا سے تم کو پہچانتا ہوں

موجود بالذات، مستجمع صفات و کمالات، اللہ رب العالمین ہے۔ عرش سے فرش تک، ذرۂ بے مقدار سے خورشید انوار تک، سب اس کے مظاہر، مجالی، جلوہ گاہ ہیں۔ وہ کل ہے، سب کچھ ہے۔ سب اس کے مظاہر ہیں۔

تُو جزوی و حق کل است گر روز چند اندیشۂ کل پیشہ کنی، کل باشی (جامیؒ)

(تُو ایک جز ہے اور حق تعالیٰ کل ہے۔ تُو، کل کی فکر اپنا لے تو تُو بھی کل ہو جائے گا)

یہ کثرت اور تفریق، بلا تشبیہ ایسی ہے جیسے اعضا، صورتِ محسوسہ میں۔، مثلاً پاؤں، آنکھ، ناک، صورتِ محسوسہ ہیں۔ یا جیسے قوائے معنویہ، صورتِ روحانیہ میں۔ مثلاً حسِ مشترک، حافظہ، متخیلہ، مفکرہ، وہم، خیال۔۔۔ (جیسے) کوئی دوست اپنے دوست کا منہ دیکھے گا تو یہی کہے گا کہ میں نے اپنے دوست کو دیکھا۔ یہ نہ کہے گا کہ میں نے اس کی صورت دیکھی۔ یہ بات یاد رکھو کہ اگر صورت مقصود بالذات ہو جائے تو وہ بے شک دوست کے دیدار سے بعید ہے۔

از لطف قد و صباحتِ خد چہ کنی دز سلسلۂ زلف مجعّد چہ کنی

از ہر طرفے جمال مطلق تاباں اے بے خبر از حسن مقیّد چہ کنی (جامیؒ)

(قد و قامت اور خد و خال میں کیا رکھا ہے، یا پیچیدہ زلفی میں کونسی خوبی ہے

اے بے خبر! ایسے حسن مقید کی کیا حیثیت، جب ہر طرف جمالِ مطلق کی تابانیاں جلوہ گر ہیں)

غیر اللہ کی پوجا تو ہوتی ہی نہیں۔ آقا اور سلطان میں شانِ ربوبیتِ حق کی جلوہ گری ہے۔ ڈاکٹر میں شانِ شافی ہے۔ مگر اپنی اپنی معرفت اور اپنا اپنا قصد ہے۔ ادنیٰ درجے کا پجاری اپنے بت میں الوہیت (یا خدائی شان) کا تخیل کرتا ہے۔ اگر یہ تخیل نہ ہوتا تو نہ پتھر کی پوجا ہوتی نہ کسی اور شئے کی۔

اسی لیے خدائے تعالیٰ نے فرمایا، قُلْ سَمُّوهُمْ (یعنی) ان سے کہو جن کی تم پوجا کرتے ہو (الرعد:۳۳)۔ ان کے نام تو رکھو۔ اگر نام بتلاتے تو کہتے۔۔ پتھر، درخت یا ستارہ۔ اگر ان سے کہا جائے کہ تم کس کی عبادت کرتے ہو تو کہیں گے ایک "دیوتا" کی۔ نہ اللہ کہیں گے، نہ مطلق الٰہ و معبود۔

بڑے لوگ، عارف اور وہ بھی اعلیٰ درجے کے، نہ کسی کو الٰہ کہتے ہیں، نہ کسی میں الوہیت سمجھتے ہیں۔ الوہیت تو سب کا مرجع و مآب ہے۔ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ، (یعنی) انجام اسی کی طرف ہے، (المائدہ: ۱۸، اور کئی آیات میں)۔ بلکہ ہر شئے کو دیکھ کر کہیں گے کہ تجلی گاہِ حق ہے۔ اور اس تجلی کے لائق واجب التعظیم ہے۔ وہ تجلیاتِ الٰہیہ کو کسی ایک مظہر میں منحصر نہ سمجھیں گے نہ کسی ایک مقام پر اڑے رہیں گے۔

ادنیٰ شخص جو کسی چیز و شئے میں تخیلِ الوہیت کرتا ہے تو کہتا ہے، مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ، (یعنی) ہم ان کی پوجا اسی لیے کرتے ہیں کہ قربِ حق ہم کو بخشیں، (الزمر:۳)۔ اعلیٰ عالم کہتا ہے

فَإِلَـٰهُكُمْ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا،(یعنی) تمھارا معبود تو ایک ہی ہے، اس کی اطاعت کرو،(الحج:۳۴)۔۔۔خود کو اس کے حوالے کر دو، جہاں سے جلوہ گر ہو، رونما ہو۔

خوش ہم سے رہے جاناں، ہم اسے عید کہتے ہیں
بس ایک کے ہو رہنا، توحید اسے کہتے ہیں (امجد حیدر آبادی)

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ،(یعنی)اور صابروں اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری دو،(الحج:۳۴)۔

اعتبار: ان لوگوں کو خوشخبری دو جن کی آتشِ طبیعت خاموش ہو گئی ہو۔ وہ کہیں گے، اللہ نے یہ کیا۔ اللہ نے وہ کیا۔ وہ نہ کہیں گے، فلاں نے یہ کیا۔ یا فلاں شخص نے وہ کیا۔ یا فلاں طبیعت کا یہ اثر ہے۔

وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا،(یعنی)انھوں نے بہتوں کو گمراہ کر دیا،(نوح:۲۴)۔

اعتبار: انھوں نے واحد حقیقی، ذاتِ مطلق کو مختلف وجوہ و نسبتوں میں بتلا کر لوگوں کو حیران کر دیا۔

آدمی تین قسم کے ہیں{جو اس آیت میں بتائے گئے ہیں}۔فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّـهِ،(یعنی)ان میں سے بعض تو وہ ہیں جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اور بعض میانہ رَو ہیں، اوسط حالت میں ہیں، اور بعض خیر کے کاموں کو لے دوڑنے والے ہیں،(فاطر:۳۲)۔

اعتبار: ان لوگوں کو حیرانی ہی عطا کر جنھوں نے اپنے نفوس کو پامالِ مظالم کیا۔ تیرے برگزیدہ ہیں، وارثِ کتاب ہیں۔ تینوں اقسام میں اول ہیں میانہ رو، اور سابق سے بھی مقدم ہیں۔

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا- (میرا دل تیرے عشق میں دیوانہ ہو گیا ہے)

محمدیوں کی دعا ہے۔زدنی فیک تحیراً ،(یعنی)خدایا! مجھے تجھ میں حیرت بڑھا۔ حیرت دو قسم کی ہے۔۱) حیرتِ محمود۔۲) حیرتِ مذموم۔ حیرتِ محمود(وہ ہے جس میں)چیز کے وجود کا یقین ہے مگر تعلیل و توجیہ(اور اسباب و وجوہات)میں حیرانی ہے، کیوں کہ نظام عالم عقل سے پرے ہے۔

سرگشتہ مثلِ مجنوں پایا تری گلی میں — گر ہوشمند کوئی پہنچا، تری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے — تیری گلی کا رستہ پوچھا، تری گلی میں
ہم نے تو لاکھ ڈھونڈا کچھ بھی پتا نہ پایا — مجنوں کدھر چھپا ہے لیلیٰ تری گلی میں

حیرتِ مذموم(وہ ہے جس میں)تعلیل ایک طرف، خود شئے کے ہونے نہ ہونے میں شک ہے۔ نہ وجود کا یقین ہے، نہ عدم کا۔۔۔

كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا،(یعنی) ان منافقین {حیرت مذموم والوں} پر روشنی پڑتی ہے تو کچھ چلتے ہیں، تصدیق کرتے ہیں، اور جب ان پر ظلمت چھا جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں، تصدیق نہیں کرتے، ایمان نہیں لاتے،(البقرۃ:۲۰)۔

اعتبار: ان حیرتِ محمود والوں پر واحدیت اسماوصفات کی تجلی ہوتی ہے تو کچھ توجیہ کرتے اور سمجھتے ہیں۔ جب احدیت اور ذاتِ بے رنگ، بے چوں و بے چگونہ کی تجلی ہوتی ہے تو حیران و بے خود کھڑے رہ جاتے ہیں۔ ان کو نہ سر کی خبر ہوتی ہے نہ پاؤں کی۔ صاحبِ محبت، حیرانِ محبت تو گھومتا رہتا ہے۔ اس کو تو حرکت دَوری رہتی ہے۔ یہ کیوں؟۔۔۔وہ قطبِ محبت کے اطراف حرکت دَوری (یعنی طواف) ہی کرتا رہتا ہے۔ محبوب کے صدقے ہوتا رہتا ہے۔ محبوب کو چھوڑ کر جائے کہاں؟۔۔۔جو سیدھا رستہ چلتا ہے حقیقتاً وہی ٹیڑھا راستہ چلتا ہے۔ وہ مقصد سے دُور ہے۔ حالاں کہ جس کا وہ طالب ہے اس سے وہ خود معمور ہے۔ اس کا ایک خیال ہے جس کا انجام مآل ہے (ایک تروتازگی ہے)۔ اس کے لیے من بھی ہے، الیٰ بھی ہے (یعنی) سے بھی ہے، تک بھی ہے۔ مبدا بھی ہے، منتہا بھی ہے۔ دونوں کے درمیان کا فاصلہ بھی ہے۔ جو حرکت دَوری کرتا ہے، وہ ذات کا بندہ ہے۔ نہ اس کی ابتدا ہے کہ 'مِن' یا 'سے' اس سے ملے۔ نہ اس کے کمال کی انتہا ہے کہ 'الیٰ' یا 'تک' لگے۔

ایک گردش ہے صورت پرکار
اور ٹھکانہ نظر نہیں آتا

اس کا وجدان تام ہے۔ اس کا ادراک کامل ہے۔ اس کے کلمات جوامع الکلم ہیں اس کے احکام مبنی بر حکم ہیں۔

مِّمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا،(یعنی) اور اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ غرقِ آب ہوئے،(نوح: ۲۵)۔

اعتبار: سابقہ اعمال نے ان کو یہاں تک پہنچایا۔ وہ دریائے علم و معرفتِ الٰہی میں غرق ہو گئے، جو عین حیرت اور چشمۂ محویت ہے۔

فَأُدْخِلُوا نَارًا،(یعنی) پھر آتشِ جہنم میں داخل ہوئے،(نوح: ۲۵)۔

اعتبار: آتش محبت میں داخل ہوئے، جو چشمۂ محویت و سکون ہے۔ محمدیوں کے لیے آیا، وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ،(یعنی) اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے،(التکویر:۶)۔ یہ مشتق ہے سجرت التّنور سے۔ جب کہ تم نے تنور سلگایا (اور بھڑکایا)۔

فَلَمْ يَجِدُوا لَهُم مِّن دُونِ اللَّـهِ أَنصَارًا،(یعنی)پھر انھوں نے خدا کے سوا اپنے مدد گار نہ پائے،(نوح: ۲۵)۔

اعتبار: سر گشتگان عشق و محبت کو فنا کر دینا ہی عین مدد ہے۔ اللہ ہی ان کا معین و مدد گار ہے۔ اپنے آپ کو فنا کر دینا بندے کا فعل نہیں، خدا کا کام ہے۔ فانی فی اللہ ابد الآباد تک مستہلک ہیں، نیست و نابود ہیں،(دراصل حیاتِ جاوداں میں ہیں۔ مرتب)۔ اگر اللہ ان کو ان کی طبیعت ان کی ابتدائی حالت پر راجع کر دے تو اس مرتبۂ بلند، درجۂ رفیعہ سے اتار دے۔ سچ پوچھو تو ہر مرتبہ اللہ ہی کا ہے۔ اللہ ہی کے ساتھ ہے۔ بلکہ اللہ کے سوا ہے کیا۔۔۔؟

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ،(یعنی)نوحؑ نے کہا یارب۔ اے میرے پروردگار!(نوح: ۲۶)۔

اعتبار: الٰہی نہ کہا۔ اس وجہ سے کہ شانِ ربوبیت کو ثبوت ہے۔ قیام ہے۔ اور الٰہ مختلف اسما میں جلوہ گر ہے۔ وہ، كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ،[(یعنی) وہ ہر وقت نئی شان میں جلوہ گر ہے،(الرحمٰن:۲۹)]۔ لفظ رب سے ان کی مراد، ثبوتِ تلوین اور تبدلِ رنگارنگی ہے۔ کیوں کہ اس مقام میں اس کے سوا دوسرا اسم مناسب نہیں۔ نہ تلوین کے سوا(اور نہ اُس کی رنگارنگی کے علاوہ) کچھ اور مقصود ہے۔

لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا،(یعنی)زمین پر کسی کافر کو نہ چھوڑ۔ ان کو فنا کر دے، دفن کر دے،(نوح:۲۶)۔

اعتبار: محبت کے، کافر عشق کے سلوک کو ختم کر دے۔ اس کو مار کر فنا کر کے شانِ احدیت میں دفن کر دے۔

کچھ نشہ نہیں ہوتا ساقی مئے خالص سے
اب ساغر و مینا میں کچھ زہر ہی ملوا دے

محمدی کہتا ہے کہ لودلّیتم بحبل لھبط علی اللّٰہ،(یعنی)اگر ڈول کو رسی کے ساتھ چھوڑو گے تو خدا ہی پر اُترے گا،(ترمذی)۔۔۔(گویا اگر تم صراط مستقیم پر چلو گے تو وہ ہی راستہ اللہ کی طرف پہنچے گا۔ مرتب)۔

لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ،(یعنی) آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے،(البقرۃ:۲۵۵)۔

اعتبار: تحت و فوق جو کچھ ہے سب میں تیرے جلوے ہیں۔ تجھ ہی سے ان کا قیام ہے۔ جب زمین میں تم دفن ہو جاؤ گے تو تم اُس کے ہو جاؤ گے، وہ تمھاری طرف بن جائے گی۔

وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ،(یعنی)ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا، پھر زمین ہی میں پہنچا دیں گے، اور پھر ایک دفعہ اس سے باہر نکالیں گے،(طٰہٰ:۵۵)۔

اعتبار: ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور دوبارہ پھر نمودار ہونگے۔

مِنَ الْكَافِرِينَ ،[(یعنی) کافروں میں سے،(نوح: ۲۶)]۔

اعتبار: اے رب ان کافروں میں سے کسی ایک کو بھی زمین پر نہ چھوڑ، جنھوں نے اپنی شیطانی انانیت سے وجود وصفات وافعالِ حق کو اپنے وجود وصفات افعال میں چھپالیا۔

غفر کے لغوی معنیٰ ستر اور چھپانے کے ہیں۔ گو قرآن میں مغفرت وعفو کے معنیٰ مراد ہیں۔ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟۔۔۔ چھپانے کے لیے۔ کیوں کہ نوح علیہ السلام چھپانا طلب کرتے تھے۔ ان کافروں میں سے کسی کو نہ چھوڑ، تاکہ جیسی دعوتِ عام تھی منفعت بھی عام ہو۔

إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ، (یعنی) اگر تو ان کو چھوڑ دے گا اور ان پر عذاب نہ لائے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے،(نوح: ۲۷)۔

اعتبار: اگر تو ان کو یوں ہی چھوڑ دے گا تو یہ لوگوں کو مقام حیرت میں ڈال دیں گے۔ لوگوں کو احکام عبودیت سے اسرار ربوبیت کی طرف لے جائیں گے، اور وہ اپنے آپ کو ارباب اور صاحب تصرف سمجھیں گے، بعد اس کے کہ اپنے آپ کو بندے سمجھتے تھے۔ پس وہ تعین، تشخص، اور مظہر اسم ظاہر ہونے کی حیثیت سے بندے ہیں، اور وجودِ حقیقی اور ہویتِ حق کی حیثیت سے ارباب ہیں۔

وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا، (یعنی) اور نہ جنیں گے مگر کھلے نافرمان اور سخت کفر کرنے والے حق پوشوں کو،(نوح:۲۷)۔

اعتبار: ان کے آرا نتیجہ بخش ہوں گے۔ وہ ظاہر کریں گے ان اسرار ربوبیت کو جو مستعد تھے اور چھپائیں گے احکام عبودیت کو جو ظاہر ہیں۔ بہر حال وہ ظاہر کو چھپائیں گے اور باطن کو ظاہر کریں گے۔ ناظرین حیران رہ جائیں گے کہ ان ظاہر کرنے والوں اور چھپانے والوں کا مقصد کیا ہے۔ حالاں کہ ہویتِ حقہ، ذات، اور ذاتِ واجبہ تو ایک ہی ہے۔

رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ، (یعنی) یارب تو مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے،(نوح:۲۸)۔

اعتبار: مجھے میری نظر سے چھپا دے۔ میری قدر کھلنے نہ پائے جس طرح کہ تیری قدر نامعلوم ہے۔ بموجب تیرے قول، وَمَا قَدَرُوا اللَّـهَ حَقَّ قَدْرِهِ کے، (یعنی) لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسی کہ قدر کرنی چاہیے،(الانعام:۹۱ اور الزمر:۶۷)۔

وَلِوَالِدَيَّ: میں جن کا نتیجہ ہوں، جن کے ملنے سے میں پیدا ہوا ہوں یعنی عقل وطبیعت، روح وجسد ان کو بھی شان احدیت میں چھپادے،(نوح:۲۸)۔

وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا،(یعنی)خدایا ان کو بخش دے جو میرے گھر میں باایمان داخل ہوں اور ایماندار مردوں اور عورتوں کو بھی بخش دے، اور ظالموں کی تباہی و بربادی بڑھاتا ہی جا،(نوح:۲۸)۔

اعتبار: میرے دل میں جو وساوس، جو خیالات، جو احادیثِ نفس {کہ تصدیق اخبار الٰہیہ کریں} ان کو اپنی تجلیات میں، اپنے وجودِ حقیقی میں، شانِ احدیت و بے چونی میں چھپالے، باایمان عقول و نفوس کو بھی۔ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا۔ جو اہل غیب ہیں، پردہائے ظلمتِ طبائع کے اُس طرف ہیں، ان کو فنا کردے، نیست و نابود کردے، مستہلک کردے، محو و محق کردے،(نوح:۲۸)، کہ روئے حق کو دیکھ کر خود کو نہ دیکھ سکیں۔

جو تجھے دیکھے بھلا تیرے سوا کیا دیکھے

محمدیوں کے حق میں ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ،(یعنی)ہر شئے فانی ہے، سوائے حق تعالیٰ کے، (القصص: ۸۸)۔ وجہِ حق کے سوائے جو کچھ ہے اپنے عدم اصلی اور مکانِ ذاتی کے لحاظ سے باطل ہے۔ ہالک ہے، نیست و نابود ہے۔

جو اسرار نوحیہ یعنی تنزیہ ذاتِ حق سے واقف ہونا چاہتا ہے وہ فلکِ شمس کی طرف ترقی کرے۔ یہ اسرار ہماری کتاب "تنزلات موصلیہ" میں مذکور ہیں۔ والسلام۔

Siddiqui Publications